زیر مسودۂ قانون وضاحت قانونِ شریعت بابت ۱۹۵۴ء

(مولانا امین احسن اصلاحی)

بیگم سلمیٰ تصدق حسین نے پنجاب اسمبلی میں مذکورۂ بالا نام سے ایک مسودۂ قانون پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے۔ یہ مسودۂ قانون بعض اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے بعض پہلوؤں پر مخالف اور موافق بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ جس اہمیت کا حامل ہے اور شریعت اور معاشرت پر اس کے جو دُور رس اثرات پڑ سکتے ہیں اس کے اعتبار سے اہل علم نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ ہمارے نزدیک اگر یہ مسودہ قانون اسی صورت میں پاس ہو جائے جس صورت میں یہ مرتب کیا گیا ہے تو اس سے وہ فوائد تو شاید حاصل نہ ہو سکیں جو اس کی فاضل مرتبہ نے اپنے پیش نظر رکھے ہیں، البتہ بہت سی ایسی خرابیاں ہمارے معاشرہ میں پھوٹ پڑیں گی جن کا خیر مقدم کرنے کے لیے دوسرے دیندار مسلمان تو درکنار، شاید خود بیگم صاحبہ موصوفہ بھی آسانی کے ساتھ تیار نہ ہوں۔ اس وجہ سے ہم اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اس مسودہ کے خام پہلوؤں کی وضاحت کر دیں تاکہ اگر بیگم صاحبہ پسند فرمائیں تو اس کی روشنی میں خود ہی اس پر نظرِ ثانی فرمالیں، ورنہ دوسرے اصحاب علم سے اس کے بارے میں مشورہ کر لیں۔ اگر وہ فی الواقع اپنی دینی بہنوں کی بھلائی چاہتی ہیں (اور مجھے یہی حسن ظن ہے کہ وہ بھلائی ہی چاہتی ہیں) تو میرے نزدیک یہ بھلائی اسی شکل میں حاصل ہو سکتی ہے جب یہ مسودۂ قانون ٹھیک ٹھیک اس روشنی میں مرتب کیا جائے جس کا اس مسودہ کے شروع میں بل کا منشا بیان کرتے ہوئے حوالہ دیا گیا ہے۔

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ اس کی فاضل مرتبہ نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وہ مسلمان قوم کی ایک فرد ہیں اور مسلمانوں کے پاس ایک ضابطۂ حیات خود اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا موجود ہے جس کے اندر ہماری زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اصولی ہدایات مرقوم ہیں چنانچہ اس مسودہ کی ابتدا میں اس کا منشا مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لہ زیر نظر مضمون میں اس بل پر تبصرہ کیا گیا ہے جس کا نوٹس ابتداءً بیگم صاحبہ نے دیا تھا اور جسے پریس میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ اسمبلی کے ۳۱ مارچ کے اجلاس میں دوسرے عنوان سے ایک مختلف بل پیش ہوا ہے جو پہلے بل سے طویل تر اور ناقص تر ہے۔ تاہم دونوں مسودوں میں کوئی حقیقی یا اصولی فرق نہیں ہے۔ اس لیے یہ مضمون دونوں کے حسن و قبح جانچنے میں مدد دے گا۔

"ہر گاہ یہ امر قرینِ مصلحت ہے کہ اسلامی قانون کے احکام متعلقہ شادی، انفساخ نکاح، طلاق، مہر اور حضانت کو قرآنی قوانین کی روح کے مطابق بنانے کے پیشِ نظر مجتمع کیا جائے اور ان کی وضاحت کی جائے"

ہم اس تمہید پر محترمہ بیگم صاحبہ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے بنیادی تقاضے کو ملحوظ رکھا اور قرآن کو زندگی کے عملی معاملات میں ایک رہنما کتاب مانا۔ اس کی نسبت اگر ہمیں کوئی شکایت ہے تو بس یہ ہے کہ ایک واضح بات ایسے الفاظ میں کہی گئی ہے جس میں اُس قسم کے ذہنی تحفظ کی ایک جھلک نظر آتی ہے جو اُن لوگوں کی باتوں کے اندر پائی جاتی ہے جو شریعت سے فرار کی راہ شریعت کا کلمہ پڑھتے ہوئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ بلاوجہ بدگمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قرآن کا نام تو لیا گیا ہے لیکن سنت کو ایک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی قانون کو اسلام کے مطابق مجتمع کرنا اور واضح کرنا پیشِ نظر ہے تو اس کے لیے تنہا قرآن ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ نبی صلعم کی سنت بھی لازمی ہے۔ اسلامی قانون کی بنیاد صرف قرآن ہی پر نہیں ہے بلکہ سنت پر بھی ہے۔ جس طرح اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی اسی طرح اسلام میں کتاب اور سنت کے درمیان کسی تفریق کی گنجائش نہیں ہے سنت سے میری مراد نبی صلعم کا ثابت شدہ طریقہ ہے۔ اسلام میں اس سے انحراف کھلا ہوا کفر ہے اور جو قانون ساری سنت سے ہٹ کر کی جائے اس کو اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کتنی ہی بلند آہنگی سے کیا جائے کہ وہ "قرآنی قوانین کی روح" کے مطابق ہے۔ اس وجہ سے اگر یہ لفظ تمہید میں سہواً چھوٹ گیا ہے تو یہ ایک بہت بڑی فروگذاشت ہے اور اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اور اگر خدانخواستہ یہاں سنت کو نظر انداز کرنے میں وہی فاسد ذہنیت کام کر رہی ہے جس کا زہر منکرین حدیث پھیلا رہے ہیں تو میں بیگم صاحبہ کی خدمت میں باادب عرض کروں گا کہ وہ اگر سنت کو نظر انداز کر رہی ہیں تو پھر قرآن کو بھی ممنونِ احسان نہ فرمائیں تو زیادہ اچھا ہے۔ اگر یہ بیڑی بھی پاؤں میں رہی تو آخر اسلام سے فرار میں اس سے کچھ نہ کچھ تو رکاوٹ پیدا ہو گی ہی۔ پھر ایسی الجھن میں پڑنے سے کیا فائدہ جس سے نہ دنیا میں کوئی نفع اور نہ آخرت میں!

پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ صاف صاف "قرآنی احکام" کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے "قرآنی قوانین کی روح" کی پر پیچ اور پر تکلف ترکیب کے استعمال کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

قرآنی احکام کی روح سے پہلے تو اس کے الفاظ کا سوال آتا ہے۔ روح کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ اس کے الفاظ کے تقاضوں سے فارغ ہو لیں۔ پہلے جو کچھ قرآن نے اپنے نصوص میں صاف صاف بتا دیا ہے اس پر اپنے قانون کی بنیاد رکھیے۔ پھر جس شعبۂ زندگی سے متعلق قرآن کے نصوص میں کوئی رہنمائی نہ مل رہی ہو وہاں اس کی روح کے مطابق قانون بنایئے۔ اور اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس پاک نبی کی سنت اور اس کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے رہنما بنایئے جو قرآنی قوانین کی روح کو سب سے زیادہ سمجھنے والا تھا۔ ہاں اگر اس کی سنت میں بھی کوئی رہنمائی نہیں مل رہی ہے تو پھر بلاشبہ آپ کو حق ہے کہ قرآنی قوانین کی روح سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔ مگر یہ بات تو نہ صرف عجیب بلکہ نہایت ہی احمقانہ ہوگی کہ آپ نہ تو قرآن کے الفاظ اور اس کے نصوص کی پروا کریں نہ نبی کی سنت کی پروا کریں بلکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنی ہوائے نفس کی رہنمائی میں قانون بنائیں اور دعویٰ یہ کریں کہ آپ نے یہ قانون "قرآنی احکام کی روح" کے مطابق بنایا ہے۔ یہ تنبیہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ آج کل ہمارے ہاں "قرآنی قوانین کی روح" کی اصطلاح بہت چلی ہوئی ہے۔ اور جن لوگوں نے یہ اصطلاح چلائی ہے ان کا منشاء اس سے یہی ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کے اندر روح تو اپنی خواہشاتِ نفس کی ہو لیکن ان پر لیبل قرآن کا چپکا دیا جائے۔ چنانچہ افسوس ہے کہ اس مسودۂ قانون کے اندر بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ دعویٰ تو یہ کیا گیا ہے کہ شادی اور نکاح سے متعلق مسائل کو قرآن کی روح کے مطابق منضبط کیا جائے۔ لیکن کیا یہ گیا ہے کہ معاشرتی خرابیوں سے زیادہ اس میں خود قرآن کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

اب ہم اصل مسودہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں اور چونکہ مسودہ کی مرتبہ نے قرآن ہی کو اس کا اصل ماخذ بتایا ہے اس وجہ سے ہم بھی بحث و استدلال میں اپنے آپ کو قرآن ہی تک محدود رکھیں گے۔

ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح اس مسودۂ قانون کے ذریعہ سے پہلی چیز جو چاہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

الف۔ کوئی مسلمان مرد تاوقتیکہ اس نے کسی دیوانی عدالت سے اس امر کے متعلق ڈگری نہ حاصل کر لی ہو کہ وہ اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کا اہل ہے، دوسری عورت سے شادی

نہیں کر سکتا۔

(ب) کوئی عدالت کسی مسلمان مرد کو، پہلی بیوی کی موجودگی میں، دوسری شادی کرنے کے لیے ڈگری دینے کی مجاز نہ ہوگی تاوقتیکہ شخص مذکور عدالت کو اس امر کے بارے میں مطمئن نہ کر دے کہ

—— اس کی بیوی کم از کم دس[1] سال کے عرصہ سے کسی متعدی مرض میں مبتلا ہے۔

—— یا وہ بانجھ ہے

—— یا وہ فاتر العقل ہے

—— اور کہ اس کے ذرائع آمدنی دونوں بیویوں اور اس کے اور ان کے بچوں کے کفیل ہو سکتے ہیں یا

—— کہ وہ دونوں بیویوں سے برابر کا انصاف روا رکھ سکتا ہے اور یکساں محبت کا برتاؤ کر سکتا ہے۔"

مختصر الفاظ میں اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بیوی رکھتے ہوئے اس قانون کے بن جانے کے بعد کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کا مجاز نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ایک دیوانی عدالت سے اس بات کی سند نہ حاصل کرے کہ وہ دوسری شادی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور کوئی عدالت اس کو دوسری شادی کی ڈگری دینے کی مجاز نہیں ہو سکتی جب تک وہ عدالت میں اپنی بیوی کا بانجھ ہونا، یا فاتر العقل ہونا، یا دس[1] سال سے کسی متعدی مرض میں مبتلا ہونا نہ ثابت کر دے۔ اور یہ نہ ثابت کر دے کہ اس کے ذرائع آمدنی اس کے لیے بھی اور اس کی دونوں بیویوں اور ان کے بچوں کے لیے بھی کافی ہیں۔ اور یہ کہ وہ دونوں بیویوں کے ساتھ برابر کا انصاف بھی کریگا اور ان کے ساتھ یکساں محبت بھی کریگا۔

جب ہم مسودہ کی اس دفعہ کو اس قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں جس کے مطابق اس کے مرتب کیے جانے کا دعویٰ کیا گیا ہے تو اس میں سب سے پہلی بات جو صریحاً قرآن کے بالکل خلاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مرد کو، اگر وہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا عقد کرنا چاہے، عدالت کی اجازت

[1] نئے بل میں کسی نامعلوم مصلحت کی بنا پر دس سال کی قید کو مرض سے ہٹا کر بانجھ پن کے ساتھ چپکا دیا گیا ہے۔

کا پابند کر دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ قرآن نے جہاں یہ اجازت دی ہے وہاں مرد پر بعض پابندیاں تو ضرور عائد کی ہیں لیکن عدالت سے اجازت حاصل کرنے کی کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی ہے۔ چنانچہ قرآن کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا

(سورۂ نساء ۳)

اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو نکاح کر لو اپنی پسند کی عورتوں سے دو دو کر کے۔ تین تین کر کے۔ چار چار کر کے۔ اور اگر اندیشہ ہو کہ تم بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر بس کرو۔ یا اپنی لونڈی پر۔ یہ طریقہ زیادہ قریب ہے اس بات سے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔

اس آیت میں ایک مرد پر جو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا چاہے مندرجۂ ذیل پابندیاں عائد کی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ اس بات کے لیے کوئی معاشرتی، خانگی، یا اخلاقی ضرورت داعی ہو، محض تنوع اور تلذذ کے لیے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا اشارہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تب) سے نکلتا ہے۔

۲۔ یہ کہ بہر حال یہ تعداد بیک وقت چار سے زیادہ نہیں ہو سکتی

۳۔ یہ کہ ان بیویوں کے ساتھ حتی الامکان مساویانہ برتاؤ کیا جائے۔

اگر ان شرطوں کے ساتھ یہ شرط بھی قرآن مرد پر عاید کرنا چاہتا کہ وہ نکاح کرنے سے پہلے عدالت سے اجازت بھی حاصل کرے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کا ذکر بھی صاف صاف نہ کر دیتا۔ لیکن اس کی تصریح تو درکنار آیت میں اس کا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔

اگر محض ان شرطوں کی بنا پر کوئی شخص یہ کہے کہ چونکہ اس زمانہ میں مرد عموماً ان شرطوں کا احترام نہیں کرتے

جس کے سبب سے بہت سی عورتیں نہایت مظلومیت اور بیکسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں، اس وجہ سے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مرد کی اس آزادی کو قدغن کر دیا جائے اور ایسا کرنا قرآنی احکام کی روح کے مطابق ہوگا تو ہم اس چیز کو مختلف پہلوؤں سے غلط سمجھتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ اللہ کی کتاب پر ایک اضافہ ہے جس کے کرنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے آپ کو اگر قرآن کی کوئی بات پسند نہیں ہے تو آپ آزاد ہیں کہ اس کو چھوڑ کر جو طریقہ بھی آپ کو پسند ہے اس کو اختیار کر لیجیے۔ لیکن یہ بڑی زیادتی ہے کہ آپ اپنی ہوائے نفس کی پیروی میں ایک بات ایجاد کریں اور پھر اس کو قرآن پر تھوپیں کہ یہ اس کے "احکام کی روح" کے مطابق ہے۔

دوسرا اعتراض اس پر یہ ہے کہ اس اضافہ سے نہ صرف یہ کہ وہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا جس کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی یہ تحریف کی جا رہی ہے بلکہ اُلٹے اس سے اس مقصد کو شدید نقصان پہنچے گا۔ اس سے ہمارا معاشرہ بھی نہایت بری طرح متاثر ہوگا اور خود عورت بھی، جس کے حقوق کے تحفظ ہی کے لیے بیگم صاحبہ نے یہ قوانین تجویز فرمائے ہیں، نہایت ہی سخت مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ ہم مسئلہ کے اس پہلو کو یہاں کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری جو بہنیں اس کو اپنے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت دے رہی ہیں وہ اس کے حقیقی عواقب سے آگاہ ہو جائیں۔

پہلے اس نقصان کو ملاحظہ فرمائیے جو اس سے خود ہماری ان بہنوں کو پہنچ سکتا ہے، جن کے تحفظ ہی کے لیے اس قانون کو بنایا جا رہا ہے۔

اگر فی الواقع ایک مرد کو، جو ایک نئے نکاح کا شائق ہے، اس نکاح کی اجازت عدالت سے اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک وہ اپنی پہلی بیوی کو بانجھ یا فاتر العقل، یا کسی مرض متعدی میں مبتلا نہ ثابت کر دے اور اپنے مالی وسائل کی کفایت اور اپنے مساویانہ سلوک کے بارہ میں بھی عدالت کو مطمئن نہ کر دے تو لازماً اس کا رجحان یہ ہوگا کہ وہ ایسی بیوی سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرے۔ اور اس کے لیے واحد راستہ جو وہ اختیار کر سکتا ہے طلاق کا راستہ ہے۔ اس وجہ سے وہ مجبوراً ایسی

راستہ اختیار کرے گا اور اُن پابندیوں کے علی الرغم جو اس مسودۂ قانون میں طلاق پر عائد کی گئی ہیں وہ طلاق کی راہ بہر حال پیدا کرہی لے گا۔ نہ اس چیز میں اس کے لیے "طلاق الاحسن" کی پابندیاں روک بن سکیں گی اور نہ وہ کسی "سببِ معقول" کے پیدا کرنے ہی سے قاصر رہے گا جیسا کہ ہم آگے چل کر طلاق کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے دکھائیں گے۔

اب غور کیجیے کہ اگر یہ قانون بن کر نافذ ہو جاتا ہے تو ہماری اُن ہزاروں بہنوں کا کیا حشر ہوگا جن کے شوہر ان کو کسی عدالت میں بانجھ یا فاتر العقل یا مدقوق تو ثابت نہیں کر سکتے لیکن وہ تنہا ان کے اوپر قناعت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یا تو وہ ان کو زنجیر پا سمجھتے ہوئے، ڈالے رکھیں گے یا ان سے کسی نہ کسی صورت میں پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ پیچھا چھڑانے کی واحد شکل جو وہ اختیار کر سکتے ہیں طلاق ہے۔ ایسی صورت میں اُن ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں شریف عورتوں کے انجام پر غور کیجیے جو اپنی جوانیاں کھو چکیں، جو اپنے شوہروں کے لیے بچے جن چکیں، اور جن کے اندر دوسرے مردوں کے لیے اب کوئی خاص کشش باقی نہیں رہی۔ کیا وہ اس قانون کے نتیجہ میں مطلقہ بن کر نہایت برا گزارا پا گذارنے پر مجبور نہ ہوں گی؟ کیا یہ کسی طرح بھی مطابقِ مصلحت ہو سکتا ہے کہ ان بیچاریوں کو سوکن کے جلاپے سے بچانے کے لیے ذلت اور مصیبت کی ایک جہنم میں جھونک دیا جائے؟ اس سوال پر غور کرتے ہوئے اس امر کو بھی ملحوظ رکھیے کہ ہمارا معاشرہ مغربی معاشرہ سے بالکل مختلف مزاج رکھتا ہے۔ اس میں ایک عورت مطلقہ بن کر صرف ازدواجی زندگی ہی سے محروم نہیں ہوتی ہے بلکہ خاندان اور برادری کے اندر اپنا بہت کچھ نسوانی شرف بھی کھو دیتی ہے۔

معاشرہ کو اس سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ بحیثیت مجموعی اس سے بھی زیادہ ہے۔ اسلام نے تعدد ازدواج کی جو اجازت دی ہے اس میں جہاں اور بہت سی شخصی اور اجتماعی مصلحتیں ہیں جیسا کہ آگے ہم بیان کریں گے وہاں اس کے اندر ایک بہت بڑی مصلحت معاشرہ کے اخلاقی تحفظ کی بھی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے عفت و عصمت کی حفاظت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس مقصد کے لیے بڑے سخت قوانین بنائے ہیں۔ زنا ایک ایسا جرم ہے جس کا اسلامی معاشرہ میں تصور بھی نہیں کیا

جاسکتا یہ ظاہر ہے کہ یہ سختی جائز اور معقول اسی حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ قانون ملا جنس غالب کے مفرط جنسی جذبات سے بے پروا نہ ہو بلکہ اگر کوئی شخص کسی سبب سے تشنگی محسوس کرتا ہے تو اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے خود قانون کے اندر ایک مناسب حد تک گنجائش موجود ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے لیے ناجائز راستے پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس کا نتیجہ پورے معاشرے کے حق میں نہایت مہلک اور خطرناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس معاشرہ نے ایک زوجگی کے اصول کو شدت کے ساتھ اپنایا ہے اس کو زنا کا دروازہ پوری وسعت کے ساتھ لازمی طور پر کھلا رکھنا پڑا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے لیے دوسرا نکاح کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے لیکن زنا وہاں شاید نکاح سے بھی زیادہ پاکیزہ سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کی تقلید میں یک زوجگی کے قانون کو اپنانے پر اصرار ہے تو پھر دوسرے پہلو میں بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کی پیروی کرنی پڑے گی۔

علاوہ ازیں کبھی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس بات کا محتاج ہو جاتا ہے کہ تعدد ازواج کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ایسی صورت میں اگر یہ طریقہ نہیں اختیار کیا جاتا تو پورے معاشرہ پر صنفی انتشار کا ایسا بحران طاری ہو جاتا ہے کہ وہی لوگ جو ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرے نکاح کے ذکر سے بھی تھراتے ہیں نکاح اور بیاہ کی سرے سے قید ہی اڑا دینے کی تجویز پر غور کرنے لگتے ہیں۔ اور جن بیگمات کی پیشانیاں سوکن کے تصور سے بھی عرق آلود ہوتی ہیں وہ اس بات کی تمنا میں مرنے لگتی ہیں کہ کاش کسی مرد کی "داشتہ" ہی بن کے زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو جائے۔ یہ محض مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ میں اس کے ثبوت میں ایک ایسے معاشرہ کی مثال پیش کر سکتا ہوں جو یک زوجگی کے نظریہ کا سب سے بڑا علم بردار اور بیگم صاحب کے نقطۂ نظر سے غالباً ایک مثالی معاشرہ ہے۔

۱۶ فروری ۵۵ء کے نوائے وقت میں اس کے لندن کے نامہ نگار کا ایک خط شائع ہوا ہے اس کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں۔

"۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگوں اور سلطنت برطانیہ کے ذراع نے انگلستان میں عورتوں

کا تناسب مردوں سے زیادہ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہاں اکثر عورتیں شادی کا ارمان دل ہی میں لیے ہوئے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ یوں تو وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہتی ہیں لیکن عورت کا حقیقی سکون انہیں میسر نہیں آتا۔ لندن کے ایک پادری صاحب لکھتے ہیں کہ آج کل اگر غلطی سے کسی دوشیزہ کو شادی شدہ سمجھ لیا جائے تو وہ چند لمحوں کے لیے باغ باغ ہو جاتی ہے۔"

" اکثر کنواری لڑکیوں نے زندگی کا مقصد ہی شادی سمجھ رکھا ہے۔ وہ شادی کے لیے ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکوں کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں۔ انہیں جو لڑکا مل جاتا ہے وہ اسے اپنا ممکنہ شوہر سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔"

پادری صاحب مزید فرماتے ہیں :-

" جو دوشیزائیں "مسز" کہلا سکتی ہیں وہ اپنے آپ کو اعلیٰ وارفع سمجھنا شروع کر دیتی ہیں اور احساسِ برتری کے مرض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ ان سہیلیوں کو ذرا نفرت سے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں جن کو شوہر نہیں ملتے۔ عام لڑکیاں جب ایک دوسری سے ملتی ہیں تو سب سے پہلے ان کی نگاہیں دوسری کی انگلی میں "شادی کی انگوٹھی" تلاش کرتی ہیں۔ ان حالات میں لڑکیاں کسی خاص شخص کے بجائے شادی کے خیال ہی سے محبت شروع کر دیتی ہیں۔"

" پادری صاحب نے گلہ کیا ہے کہ لڑکی جوں ہی پندرہ کے سن میں پہنچتی ہے اسے شادی کا خیال ستانا شروع کر دیتا ہے ــــ دراصل یہ شکایت فضول ہے۔ انگلستان (اور یورپ میں بھی) مردوں کی کمی ایک معاشرتی مسئلہ بن چکی ہے اور مغربی تہذیب میں بے راہ روی کے جو گھناؤنے مظاہرے نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہی مردوں کی کمی ہے۔ عورت کی شادی کی خواہش قدرتی خواہش ہے۔ لیکن مغرب کے داناؤں نے اس کا علاج یہ نکالا ہے کہ مرد شادی تو ایک کرے لیکن عیاشی جتنی عورتوں سے چاہے کرے۔ مغربی تہذیب، مذہب، اور قانون یہ تو برداشت کر لیتے ہیں کہ شادی شدہ مرد داشتہ رکھ لے۔ لیکن ان کے نزدیک دوسری شادی معیوب اور تہذیب کے خلاف ہے۔"

دیکھ لیجیے انگلستان اور یورپ کا معاشرہ اس وقت جس بحران میں مبتلا ہے اس کا واحد علاج تعدد ازواج ہے لیکن ان ملکوں کے لال بجھکڑ زنا کو تو ثواب قرار دے لیں گے لیکن ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کے ذکر کو بھی خلافِ تہذیب قرار دینگے۔ اور یہی حال وہاں کی عورتوں کا بھی ہے۔ وہ بیسوا اور داشتہ بن کر زندگی بسر کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں خیال کرتیں، بلکہ کتنی اس ارمان میں بوڑھی ہو جاتی ہیں، لیکن اگر ان کے سامنے تعدد ازواج کا نام بھی لے لیجیے تو یہ ان کی شان میں ایک ایسی گستاخی ہو گی جو کسی طرح بھی قابلِ معافی نہیں ——— ہمارے ملک کی بیگمات بھی یہی چاہتی ہیں کہ اور چاہے جو پاپڑ بھی بیلنے پڑیں لیکن تعدد ازواج کی لعنت بہر حال اس ملک سے ختم ہونی چاہیے۔ ان بہنوں کی خواہش اور کوشش اگر یہی ہے تو یہ چیز تو ختم ہو جائے گی لیکن اس کو خوب یاد رکھیے کہ اس کے بعد کی منزل وہی ہے جس سے آج انگلستان کی عورتیں گذر رہی ہیں۔

ایک بیگم صاحبہ نے جو الپوا کی بیگمات میں ایک بڑا مقام رکھتی ہیں ابھی پچھلے دنوں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ان کے حقوق مردوں نے سیدھے سیدھے نہ دیئے تو پاکستان کی عورتیں بھی وہی طریقے اختیار کریں گی جو ان کی مغربی بہنوں نے اختیار کر لیے۔ ان کی مغربی بہنوں نے جو طریقے اختیار کیے ہیں اور اس سے انہوں نے جو شاندار نتائج حاصل کیے ہیں اس کا ایک ہلکا سا تصور دینے کے لیے ہم ذیل میں اسی اخبار کے نامہ نگار کی ایک چٹھی کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا ایک اقتباس ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ اس سے انہیں بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ ان کی مغربی بہنوں نے کیا کچھ پایا ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر یہ کیا کچھ پائیں گی۔ نامہ نگار کا بیان ملاحظہ ہو۔

"آپ پوچھیں گے کہ لندن میں اتنی لڑکیاں کیوں ہیں؟

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ گذشتہ دو جنگوں اور سلطنت برطانیہ کو برقرار رکھنے کی کوشش میں بے شمار مرد کام آچکے ہیں۔ سارے برطانیہ ہی میں یورپ کی طرح عورتوں کی تعداد زیادہ اور مردوں کی کم ہے۔

دوسرے ہر سال ہزاروں لڑکیاں جرمنی، فرانس اور اٹلی سے "لندن کی شہرت" کے قصے سن کر

روزی اور شوہر ـــــ کی تلاش میں لندن آجاتی ہیں۔

تیسرے ہر سال کوئی پچیس ہزار لڑکیاں برطانیہ کے مختلف صوبوں سے آتی ہیں۔ کیوں؟

گھر میں ماں "بوائے فرینڈ" سے ملنے پر اعتراض کرتی تھی۔ یہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہیں منگیتر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایکٹریس بننے کا شوق بھی صاحبزادیوں کو چرانا ہے۔ اور کچھ "دنیا دیکھنے" گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ اور پھر یہاں پر سینکڑوں شاخوں والے "لائنز" اور اے۔ بی۔ سی کے سستے کھانے والے ریستوران ہیں جہاں ہزاروں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ "وول ورتھ" اور "اسپنسر اینڈ مارکس" کے وسیع و عریض اسٹوروں میں "شاپ گرل" بن سکتی ہیں۔ ہوٹلوں میں RECEPTONIST بن سکتی ہیں سکرٹری بن سکتی ہیں، ـــــ اور فوٹو گرافروں کے "ماڈل" اور ہندوستانی اور پاکستانی "شہزادوں" کے "حرم" کی زینت . . . . "

"ان میں سے اکثر چار پانچ پونڈ سے لے کر سات آٹھ پونڈ فی ہفتہ تک کماتی ہیں جس سے بمشکل یہ اپنا ضروری خرچ چلاتی اور کپڑے وغیرہ بناتی ہیں۔ اور جنہیں کچھ بچا کر اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی بھیجنا ہوتا ہے وہ زندہ رہنے کے لیے پوری غذا بھی نہیں کھا سکتیں ـــــ اور تقریباً تمام شام کو تفریح کے لیے "شکار" کی تلاش میں رہتی ہیں، جو انہیں پکچر دکھا دے، ریستوران میں ایک وقت کا کھانا کھلا دے، یا کسی اچھے کافی ہاؤس میں کافی کی ایک پیالی ہی پلا دے ـــــ اور انہیں "آزادی" اور "دنیا دیکھنے" کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔"

یہاں عورت "آزاد" ہے لیکن اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ یہاں عام عورت کی کوئی عزت نہیں کوئی مقام نہیں۔ اگر وہ مشرق کی "مظلوم عورت" کی "جیل کی زندگی" کی ایک جھلک دیکھ لے تو آزادی اور مساوات سے فوراً توبہ کر لے۔ یہاں ہزاروں عورتیں ساری عمر گھر اور اولاد کو ترستے ہوئے زندگی بسر کر دیتی ہیں۔ اور انہیں اپنی مظلومی اور کس مپرسی کا احساس ہوتا ہے۔"

(نوائے وقت مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۵۵ء)

یہ اقتباسات ہم ان بہنوں کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتے ہیں جو دھمکی دیتی ہیں کہ اگر ان کے مطالبہ

مساوات اور ان کے حقوق کو سیدھے سیدھے تسلیم نہ کیا گیا تو وہ اپنی مغربی بہنوں کے طور طریقے اختیار کرلیں گی وہ اگر ٹھنڈے دل سے اپنی مغربی بہنوں کی اس درگت کا جائزہ لیں گی تو ہمیں امید ہے کہ ان کے مقابل میں اپنی حالت کو بدرجہا بہتر پائیں گی اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں گی لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ دلوں کے مچلتے ہوئے جذبات اول تو کسی حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ دوسرے ہماری ان بہنوں کو اس کا اتفاق ہی کب ہوتا ہے۔ کہ وہ یورپ یا امریکہ کی عام عورت کی واقعی زندگی کا اندازہ کرسکیں؟ انہیں تو عموماً انہی عورتوں کو دیکھنے کے مواقع ملتے ہیں جو انہی کی طرح بالکل فارغ البال ہیں۔ اور سیر سپاٹے کے سوا جن کا کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

بات اپنے دائرہ سے باہر نکلی جا رہی ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب معاشرہ اس کا محتاج ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کے طریقہ پر عمل کرے لیکن محض جھوٹی صاحبیت کی پاسداری میں اس پر عمل نہیں کیا جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زنا عام ہو جاتا ہے، عورت کی قیمت دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نہ تو اسے کسی مشرقی کی بدنام "حرم" میں داخل ہونے سے انکار کی مجال رہ جاتی۔ اور نہ ہی وہ کسی کی "داشتہ" بننے میں کوئی عار محسوس کرتی۔ بلکہ زندگی بھر اس ارمان میں رہتی ہے کہ کاش کوئی آدم کا بیٹا جھوٹ موٹ ہی اپنی طرف اس کو منسوب ہونے کی عزت سے سرفراز کر دے۔

ممکن ہے اس پر یہ کہا جائے کہ اگر یورپ کے ملکوں میں یہ صورت حال ہے تو وہاں تعدد ازدواج کو جائز ہونا چاہیے، لیکن ہمارے ملک میں یہ صورت حال نہیں ہے، یہاں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابل میں کم ہے، اس وجہ سے یہاں اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے جواب میں گذارش ہے کہ اگر آپ کے ہاں صورتِ حال یہ نہیں ہے تو تعدد ازدواج یہاں کب عام ہے؟ غربا کا طبقہ جو اس ملک کی اصلی آبادی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک سے زیادہ بیوی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ان کے اندر تو شاید لاکھوں میں کوئی مثال تعدد ازدواج کی مشکل سے مل سکے۔ صرف خاص خاص برادریاں ہیں جن کے کھاتے پیتے گھرانوں میں یہ خرابی موجود ہے کہ ان کے بعض افراد ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے ہیں اور بدقسمتی سے انکی کی مثالیں بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہیں کہ وہ عموماً بیویوں میں انصاف اور مساوات کے تصور سے بالکل

عاری ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ایک جزوی شر کو مٹانے کے لیے ایک ایسا قانون بنا ڈالا جائے جو معاشرہ کو ایک ناروا پابندی میں باندھ کے رکھ تو دیگا لیکن اس سے ان مظلوموں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچیگا جن کی حمایت کی آڑ لے کر یہ قانون بنایا جا رہا ہے۔ اس قانون کا لازمی نتیجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ نکلے گا کہ نکاح جدید کے شائقین اپنی ان بیویوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے جو ان کی اس خواہش کے راستہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ اور ہمارے موجودہ معاشرے میں شاید ہزار میں سے پانچ عورتیں بھی اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ تو ان کی حفاظت کے لیے قانون بنائیں گی اور ان بیچاریوں کے زندگی کے رہے سہے سہارے بھی چھن جائیں گے۔

یہ خرابی ہمارے معاشرہ میں اب تک جس پیمانہ پر ہے اس کے علاج کے لیے بجائے اس کے کہ ایک غلط قسم کے قانون کی بیڑی اپنے پاؤں میں ڈال لی جائے، یہ بالکل کافی ہے کہ معاشرہ میں اسلامی حقوق عدل وانصاف کا احساس پیدا کیا جائے۔ مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں میں اس بات کا کماحقہٗ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اپنے شوہروں سے ان حقوق کے لیے جرأت کے ساتھ لڑ سکیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں۔ اور ہمارے ہر شہر کے اندر خواتین کی ایسی انجمنیں بھی ہونی چاہئیں جو اس قسم کی مظلوم خواتین کی مدد کریں اور اگر وہ اپنے شوہروں کی طرف سے نان نفقہ اور حقوق زوجیت سے محروم کی جا رہی ہوں تو اسلامی قوانین کے مطابق عدالتوں کے ذریعہ سے ان کے حقوق دلوائیں یا ان کے لیے خلع اور فسخ نکاح کا مطالبہ کریں۔

تعدد ازواج اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ شروع سے یہ چیز موجود ہے۔ لیکن صحابہؓ اور نبی صلعم کے زمانہ میں بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی کسی شخص کی مجال نہیں تھی کہ وہ اپنی ایک سے زیادہ بیویوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی ادنیٰ ناانصافی بھی کر سکے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اوّل تو معاشرہ میں اس بات کا احساس تھا کہ اسلام میں اس قسم کی ناانصافی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ثانیاً خود عورتوں کے اندر بھی اپنے حقوق کا اتنی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ جہاں ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوئی وہ فوراً اپنا معاملہ عدالت میں لے کر پہنچیں۔ ثالثاً اس وقت کی عدالتیں بھی آج کل کی عدالتوں کی طرح نہیں تھیں کہ ان سے کمزور کے

لیے انصاف حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے ہم معنی ہو۔ پھر آج بھی اگر مقصود مظلوم عورتوں کی حمایت ہی ہے نہ کہ محض مغرب کی اندھی تقلید میں اسلامی اصولوں کی قطع و برید، تو آخر یہ طریقہ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا کیوں نہیں اختیار کیا جا سکتا؟

چند مزید خرابیاں یہاں تک تو ہم نے صرف اس عام خرابی کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس بل کے قانون بن جانے کی صورت میں رونما ہوگی۔ لیکن اس کے علاوہ اس میں اسی مسئلہ سے متعلق بعض اور بھی ایسی شرطیں عائد کی گئی ہیں جو اپنے محل میں اگرچہ صحیح ہوں لیکن بیگم صاحبہ نے ان کو بالکل بے محل عائد کر کے عجیب قسم کا تضاد پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً اس قانون کی رو سے اگر کوئی شخص ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کو نہ صرف ایک دیوانی عدالت سے اس کے لیے ڈگری حاصل کرنی پڑے گی، نہ صرف شادی کے لیے اہلیت کا باقاعدہ عدالتی ثبوت مہیا کرنا پڑے گا، نہ صرف اپنی موجودہ بیوی کو مدقوق یا بانجھ یا فاتر العقل ثابت کرنا پڑے گا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کرنا پڑیگا کہ اس کی آمدنی دونوں بیویوں اور ان کے بچوں کے لیے کفایت کر سکتی ہے اور وہ ان دونوں کے ساتھ یکساں انصاف بھی کرے گا اور یکساں محبت بھی کرے گا۔

گذارش یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی موجودہ بیوی کو مبتلائے برص و دق یا بانجھ یا فاتر العقل ثابت کر دیا تو اس کے بارہ میں یہ سوال کہاں پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس بیوی کے ساتھ اور اپنی نئی بیوی کے ساتھ یکساں انصاف بھی کرے گا اور یکساں محبت بھی کرے گا۔ اس کے متعلق اگر کوئی جائز سوال پیدا ہوتا ہے تو محض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شوہر اس کو اپنے حبالۂ عقد میں رکھنا چاہتا ہے تو اس کو روٹی اور کپڑا دیتا رہے۔ یہ تو غریب شوہر کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی کہ اس سے ایک فاتر العقل اور مجنون یا بانجھ یا مبروص عورت کے ساتھ فرائض زوجیت ادا کرنے کا بھی مطالبہ کیا جائے اور برابر کی محبت کا بھی تقاضا کیا جائے اور وہ بھی ایک دیوانی عدالت کے ذریعہ سے۔

آخر عدالت کے پاس اس چیز کے معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہوگا کہ اس شخص کا ذریعۂ آمدنی نہ صرف دونوں بیویوں کے لیے کفایت کرے گا بلکہ ان سے پیدا ہونے والے بچوں کے لیے بھی کفایت کرے گا اور

بہ کہ یہ دونوں کے ساتھ یکساں انصاف بھی کرے گا اور یکساں محبت بھی کرے گا؟ یہ کون بتا سکتا ہے کہ اس شخص کے دونوں بیویوں سے کتنے بچے ہونگے اور اس کی جو آمدنی آج ہے کل بھی وہ باقی رہے گی یا نہیں رہے گی؟ جو شخص بھی نئی شادی کا ارمان لے کر عدالت میں جائے گا وہ یہ تو کہنے سے رہا کہ میں دونوں بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کرونگا یا دونوں کے ساتھ یکساں محبت نہیں کرونگا۔ وہ تو لازماً یہی کہیگا کہ میں دونوں پر جان نثار کردوں گا۔ آخر عدالت یہ کس طرح معلوم کرے گی کہ یہ صحیح کہہ رہا ہے یا غلط۔ آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر قائم بھی رہے گا؟ اگر کہا جائے کہ اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے تو یہ تو ایک ایسی چیز ہے جس کا حق عام اسلامی قانون کے تحت ہر عورت کو حاصل ہے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر سے اس قسم کی کسی زیادتی کی شکایت رکھتی ہے تو اسلامی قانون کی رُو سے عدالت میں مرافعہ کر سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شادی سے پہلے عدالت میں اس معاملہ کے لے جانے کا کیا فائدہ ہوا؟

پھر ستم یہ ہے کہ شوہر اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی اگر عدالت سے دوسری شادی کی اجازت حاصل کرلے تو بیگم صاحبہ کے اس بل کی رو سے موجودہ بیوی کو طلاق یا افتراق کے مطالبہ کا قانونی حق حاصل ہوگا۔ طلاق کا مفہوم تو واضح ہے۔ افتراق کا مطلب غالباً یہ ہے کہ بیوی صاحبہ قیام تو فرمائیں گی میاں سے بالکل الگ تھلگ لیکن ان کے جملہ مصارف میاں کے سر ہونگے۔ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ مصارف کچھ ایسے ویسے نہیں ہونگے بلکہ میاں کو اپنی کل آمدنی کا چوتھائی حصہ بیوی صاحبہ کی نذر کرنا پڑے گا۔ اور یہ ادائیگی اس طرح ہوگی کہ یہ رقم ہر مہینہ کی دسویں تاریخ کو عدالت میں جمع کرانی پڑے گی۔ اور اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہا تو یہ رقم بطور بقایا مالیہ اراضی وصول کی جائے گی۔

گذارش یہ ہے کہ اگر آخر انجام یہی ہونا تھا کہ اس تمام ہفت خوان عدل و انصاف کے طے کرنے کے بعد بھی بات اونچی بیوی صاحبہ ہی کی رہے گی، انہیں طلاق کے مطالبہ کا بھی حق رہے گا اور افتراق کے مطالبہ کا بھی؛ اور غریب شوہر کی مجموعی آمدنی کے چوتھائی حصہ کے ہتھیانے کا بھی تو پھر ان بہت ساری دفعات کی کیا ضرورت تھی۔ تب تو بس یہ ایک ہی دفعہ سارے قضیہ کو طے کر دینے کے لیے کافی تھی کہ اگر کوئی مرد

غلطی سے دوسری شادی کی جرأت کر بیٹھے تو اس کی پہلی بیوی کو طلاق یا افتراق کے مطالبہ کا حق ہونا چاہیے اور بصورت افتراق شوہر کی چوتھائی آمدنی پر مالکانہ متصرف ہونے کا۔ بلکہ یہ بھی ایک تکلف ہے۔ پھر تو آسان راستہ وہی ہے جس کی طرف اپوا کی شاخ کراچی کی محترمہ صدر صاحبہ نے اپنی ایک تقریر میں جو انہوں نے کراچی کی اپوا کانفرنس میں فرمائی ہے، رہنمائی کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر مرد دوسری شادی کرے تو ایسی صورت میں عورت کو قانونی طور پر یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو طلاق دے دے۔

یہ امر بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ بصورت افتراق کل آمدنی کا چوتھائی حصہ بطور نان نفقہ دینا تجویز کیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ بیوی کا کل حصہ شوہر کی میراث میں اکثر حالات میں آٹھواں اور صرف بعض حالات میں چوتھائی ہے۔ اور یہ نفقہ ان بیوی صاحبہ کے لیے تجویز کیا گیا ہے جو یا تو پاگل ہیں یا مدقوق یا فاترالعقل بھلا بتائیے کہ کون فاترالعقل مرد ہے جو ایسی خوبیاں رکھنے والی بیگم صاحبہ کو سفید ہاتھی کی طرح پالیگا۔ پھر تو جس قیمت پر بھی ممکن ہو اس کی کوشش اور آرزو یہی ہوگی کہ وہ ان کو "طلاق احسن" دے کر بطریق احسن ان کے میکہ رخصت کرے۔ اگرچہ ان کو وہاں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ ہو سکے۔

نان نفقہ کے متعلق یہ فقاہت ہمارے سامنے بالکل پہلی مرتبہ آئی ہے کہ وہ مرد کی مجموعی آمدنی کا چوتھائی حصہ ہونا چاہیے۔ قرآن نے اس سلسلہ میں جو رہنمائی کی ہے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں معیار مجموعی آمدنی نہیں بلکہ آدمی کا معیار معیشت (STANDARD OF LIVING) ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مجموعی آمدنی اور معیار معیشت میں بڑا فرق ہے۔ فرض کیجیے ایک مرد کی کل آمدنی سو روپے ماہوار ہے اور اس کے چار پانچ بچے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کو وہ افتاد پیش آجائے کہ اس کی بیوی افتراق کا مطالبہ کر بیٹھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلی بیوی صاحبہ کے لیے تو ہر مہینے کی دسویں کو اپنی تنخواہ کے پچیس روپے سرکاری خزانے میں جمع کر دے گا اور خود چار پانچ بچوں اور اگر بوڑھے ماں باپ بھی خیر سے زندہ ہوں تو سات آٹھ افراد کے پورے کنبے کی پرورش پچھتر روپے میں کرے۔ اور اگر اس آزمائش میں خدانخواستہ کوئی ایسے بزرگ مبتلا ہو جائیں جو کارخانہ داروں اور مالکان مل کے زمرہ میں شامل ہیں یا صف اول کے تاجروں میں ہیں، یا چوٹی کے زمینداروں میں ہیں تو

مجبور ہوں گے کہ ہر مہینے حساب کر کے اپنی مجموعی آمد کا چوتھائی حصہ ان افتراق پسند کرنے والی بیوی کے حوالہ کریں درانحالیکہ وہ خود اپنی ذات اور اپنی نئی نویلی بیوی پر اپنے پورے کنبے سمیت مشکل سے اپنی کل آمدنی کا چوتھائی حصہ خرچ کرتے ہونگے۔

یہ بات کہ قرآن مجید نے نان نفقہ کے معاملہ میں معیار آمدنی کو نہیں بلکہ معیشت کو قرار دیا ہے نہایت آسانی سے اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر اس کو یہی معیار قرار دینا ہوتا تو وہ نہایت مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتا تھا کہ اپنی بیویوں کو اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی بطور نان نفقہ دیا کرو۔ لیکن اس نے جہاں کہیں بھی نان نفقہ کا ذکر کیا ہے کہیں بھی یہ الفاظ نہیں استعمال کیے ہیں۔ بلکہ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قرآن معیشت کو نان نفقہ کے لیے معیار قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو چند آیتیں:-

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ (بقرہ)	اور باپ پر ان کو کھلانا اور پہنانا ہے دستور کے مطابق۔ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ نہ بوجھ ڈالا جائے۔ نہ ماں کو اس کے بچہ کے سبب سے کوئی نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کے سبب سے۔
أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (سورہ طلاق)	اور ان کو رکھو اس حیثیت سے جس حیثیت سے تم اپنی مقدرت کے مطابق رہتے ہو۔ اور ان کو تنگ کرنے کے لیے ان کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ وہ وضع حمل سے فارغ ہو جائیں۔ اور اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو دودھ پلائی دو۔ اور اس کے لیے رواج کے مطابق آپس میں قرارداد کر لو۔ اور اگر اس میں دشواری محسوس کرو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلادیگی اور گنجائش والے اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کریں اور جس کی روزی تنگ ہو تو جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے اسی

میں سے خرچ کرے۔ اللہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اتنا ہی جتنا اس کو دیا ہے۔

یہ دونوں آیتیں ایسی ہی عورتوں کے نان نفقہ سے متعلق ہیں جن کے لیے بیگم سلمیٰ تصدق حسین صاحب کا یہ بل ہے۔ لیکن ان میں کہیں آمدنی کا کوئی متعین حصہ نان نفقہ کے لیے تجویز نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو دستور اور معروف پر چھوڑا گیا ہے کہ ایک شخص اپنے معیارِ زندگی کے لحاظ سے نان نفقہ دے۔ خواہ وہ اس کو خود باہم طے کر لیں یا دو پنچ مل کر طے کر دیں، یا کوئی عدالت ان کے حالات اور معیارِ زندگی کو سامنے رکھ کر طے کر دے۔

مسئلۂ طلاق طلاق سے متعلق بیگم صاحبہ جو قانون بنوانا چاہتی ہیں اس کی پہلی دفعہ یہ ہے:۔

"طلاق کی تمام صورتیں ماسوا طلاق الاحسن کے ناجائز تصور کی جائیں گی"

اس کی دوسری دفعہ یہ ہے:۔

"طلاق صرف اس صورت میں جائز تصور کی جائے گی جبکہ کسی قانونی عدالت نے شوہر کو یہ ڈگری دے دی ہو کہ طلاق بطریقِ احسن دی گئی ہے۔ اور اس کے لیے معقول وجوہ کارفرما تھیں"

بیگم صاحبہ نے جس طرح ایک بیوی کی موجودگی کی حالت میں دوسری شادی کے معاملہ کو عدالت کے ساتھ باندھ کر رکھ دیا ہے، اسی طرح طلاق کے معاملہ میں بھی شوہر کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اس کو عدالت کی عبادت کا پابند بنا دیا ہے۔ اور ساتھ ہی عدالتوں پر یہ پابندی عائد کر دی ہے کہ اوّل تو وہ طلاق الاحسن کے سوا کسی اور طریقہ پر دی ہوئی طلاق کو طلاق ہی تسلیم نہ کریں، وہ لازماً اس بات کی تحقیق کریں کہ طلاق بطریقِ احسن دی گئی ہے یا نہیں۔ ثانیاً وہ طلاق کے ہر معاملہ میں اس بات کو بھی دیکھیں کہ طلاق کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں یا نہیں اگر معقول وجوہ موجود نہ پائیں تو وہ طلاق کو سرے سے جائز ہی نہ قرار دیں۔

اب آئیے دیکھیے کہ اگر یہ قانون بن جاتا ہے تو اس سے کیا کیا مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلی دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے معاملہ کو قرآن مجید نے سرتاسر شوہر کی صوابدید پر چھوڑا ہے۔ ان معاملات میں اس کی آزادی کو ہرگز کسی قاضی یا کسی عدالت کے فیصلوں کا پابند

نہیں کیا ہے۔ قرآن کا صاف ارشاد ہے کہ بیدہٖ عقدۃ النکاح (اس کے اختیار میں رشتۂ نکاح کی گرہ ہے) جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اس گرہ کے باندھنے اور کھولنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ تاریخِ اسلامی کے ہر دور میں اور ہر مسلمان حکومت میں پوری امت کا اسی پر عمل رہا ہے، اور اسی پر عمل ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ مرد کی اس آزادی کو سلب کر کے اس کو عدالت کے فیصلہ کا تابع بنا رہی ہیں۔

دوسری چیز اس میں قابلِ غور یہ ہے کہ شریعت نے اگر طلاق کے معاملہ کو مرد کی صوابدید اور اس کے فیصلہ پر چھوڑا تھا تو خدانخواستہ کوئی بیوقوفی نہیں کی تھی کہ آج بیگم صاحبہ کو اس کی اصلاح کی ضرورت پیش آئے۔ اصل یہ ہے کہ طلاق کوئی لذت یا تفریح کی چیز نہیں ہے۔ جو شخص بھی طلاق دیتا ہے (الا ماشاء اللہ) وہ مجبور ہی ہو کر اور با دلِ ناخواستہ ہی طلاق دیتا ہے۔ اور اکثر حالات میں اس کا کوئی نہ کوئی سبب بھی موجود رہتا ہے جو میاں اور بیوی اور ان کے رازداروں کے علم میں تو ہوتا ہے لیکن نہ تو میاں کی یہ مصلحت ہوتی ہے کہ اس کا عام طور پر اظہار ہو اور نہ عورت ہی کے لیے یہ کچھ بہتر ہوتا ہے کہ یہ چیز کہیں زیرِ بحث آئے۔ بلکہ عموماً اس کا زیرِ بحث آنا کمزور فریق ہونے کے سبب سے عورت کے لیے زیادہ مضر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اغلباً دونوں فریق کی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ چپ چپاتے طلاق ہو جائے اور خواہ مخواہ کو اس کے اسباب کی زیادہ کھوج کرید نہ ہو۔ ایک خاص حد تک اگر اس معاملہ میں دونوں فریق کے اولیا یا بزرگانِ خاندان دخل دیں اور اپنے اثرات سے کام لے کر فریقین میں صلح کرا دیں تو قرآن نے اس کو نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ مگر بیگم صاحبہ ہر طلاق کو جو ایک عدالتی معاملہ بنا رہی ہیں تو یہ ایک بہت بڑے فتنہ کی ذمہ داری اپنے سر لے رہی ہیں اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ خود انہی کی بہنیں اس قانون کے بنوانے پر ان کو گالیاں دیں گی اور ان پر لعنت بھیجیں گی۔

تیسری چیز اس سلسلہ میں یہ قابلِ غور ہے کہ طلاق کے معاملہ کو عدالتوں کے ساتھ باندھ دینا تجربہ سے کچھ مفید نہیں ثابت ہوا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو اس سے ایسی ناقابلِ برداشت مصیبت پیدا ہو گئی ہے کہ لوگ چیخ اٹھے ہیں۔ رائٹر کی ایک تازہ خبر ملاحظہ ہو:۔

"ایتھنز۔ ۱۸ مارچ۔ پانچ ہزار سے زیادہ کشتگانِ "قانونِ ازدواج" نے یونانی وزیر اعظم فیلڈ مارشل

پاپاگوس سے ایک یادداشت میں اپیل کی ہے کہ طلاق کے یونانی قواعد کو سہل بنانے کے لیے اقدام کریں۔ ان کشتگان قانونِ ازدواج نے یادداشت میں دعویٰ کیا ہے کہ انہیں اپنی بیویوں سے جدا ہوئے پانچ سے لے کر بیس برس تک ہو چکے ہیں لیکن موجودہ قوانین نے انہیں ابھی تک طلاق دینے کی اجازت نہیں دی۔

طلاق کے یونانی قوانین زیادہ پرانے تو نہیں ہیں لیکن ان کے تحت بیوی کو دماغی اخلاقی، یا جسمانی کمزوری کی بنا پر ہی طلاق دی جا سکتی ہے۔" (نوائے وقت ۱۱ مارچ)

بیگم سلمیٰ تصدق حسین صاحبہ نے بھی کم و بیش انہی لائنوں پر اپنا مسودہ مرتب فرمایا ہے اس وجہ سے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے نتائج بعض حالات میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اتنے خطرناک نکل سکتے ہیں کہ آج ان کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات بھی اپنے اندر متعدد قباحتیں رکھتی ہے کہ ایک طلاق احسن کے سوا طلاق کے دوسرے تمام طریقے ناجائز تصور کیے جائیں گے۔

طلاق احسن کا طریقہ جو قرآن نے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ شوہر علی الترتیب دو طہروں میں اپنی بیوی کو الگ الگ دو طلاقیں دے۔ پھر تیسرے مہینے میں یا تو اس سے رجعت کر لے، اگر رجعت کرنا چاہتا ہے، ورنہ خوبصورتی کے ساتھ اس کو رخصت کر دے۔ اس دوران میں بہتر یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک ہی مکان میں رہیں تاکہ اگر ان کے اندر سازگاری پیدا ہونے کا کوئی ادنیٰ امکان بھی ہو تو یہ یکجائی اس کے لیے محرک کا کام دے سکے۔

اگر اس طلاق کے سوا طلاق کی دوسری تمام شکلیں ناجائز قرار دے دی جائیں، جیسا کہ بیگم صاحبہ کی تجویز ہے، تو ان حالات میں کیا کیا جائے گا جن میں میاں بیوی کی یا تو یکجائی سرے سے متعذر ہے یا تین مہینے انتظار کرنے کے لیے نہ تو نقلی کوئی وجہ موجود ہے نہ عقلی؛ نابالغہ، غیر مدخولہ، اور کسی دوسرے ملک میں رہ جانے والی بیویوں کے طلاق کے معاملات آخر اس ایک ہی ضابطہ پر کس طرح پورے اتریں گے؟

طلاق احسن کے سوا طلاق کے کسی دوسرے طریقے کا عدالتوں کا درخور اعتنا نہ سمجھنا اس حالت میں

تو بیشک اچھا خیال کیا جائے گا جبکہ میاں بھی اس بات پر پچھتا رہا ہو کہ وہ کیوں ایک ہی مرتبہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے بیٹھا۔ اور بیوی بھی اس غم میں نڈھال ہو رہی ہو کہ وہ اپنے محبوب شوہر سے محروم ہو گئی۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ شوہر نے انتہائی نفرت کے ساتھ بیوی کو طلاق دی ہو اور وہ بدستور اس نفرت پر قائم بھی ہو تو ایسی صورت میں اگر عدالت اس کی طلاق اس بنا پر ناجائز ٹھہراتی ہے کہ یہ طلاق احسن نہیں ہے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ وہ ایک ایسی بیوی کو اس کے سر زبردستی منڈھ رہی ہے جس سے اس کے دل کا ریشہ ریشہ بیزار ہے۔ کیا یہ عورت کے ساتھ کوئی احسان ہو گا؟ ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اگر شوہر کو اس کی بیوی واقعی ناپسند ہو گی تو اس کے لیے اس سے از سر نو چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے طلاق احسن کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن فرض کیجیے وہ عورت اپنے شوہر سے دل و جان سے بیزار تھی اور ان تین طلاقوں سے وہ خوش ہوئی تھی کہ چلو ایک عذاب سے رہائی ہوئی۔ لیکن بیگم صاحبہ کے اس قانون کے بعد وہ مظلوم عورت مجبور ہو گی کہ بدستور اپنے ظالم شوہر کے ساتھ بندھی ہی رہے۔ کیونکہ اس کی طلاق بیگم صاحبہ کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق نہیں ہے۔ کیا یہ اس عورت کے ساتھ کوئی احسان ہو گا؟

ایک ہی نشست میں تین طلاقوں کے معاملہ کو بھی اس معنی میں بدعت سمجھنا صحیح نہیں ہے جس معنی میں بیگم صاحبہ نے اس کو بدعت سمجھا ہے۔ یہ چیز حضرت عمرؓ جیسے خلیفۂ راشد کے اجتہادات میں سے ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ طلاق کو جو تین مہینوں کے اندر دینے کی پابندی عائد کی گئی ہے یہ شوہر کے فائدہ کے لیے عائد کی گئی ہے تاکہ اس دوران میں اگر وہ چاہے تو اپنی بیوی سے رجوع کر سکے۔ لیکن اگر ایک شوہر اپنے اس حق سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تو اسے بہرحال یہ حق حاصل ہے کہ وہ از خود اپنے کسی حق سے دستبردار ہو جائے۔ اس سبب سے ایک ہی نشست کی تین طلاقوں کو وہ نافذ تو کر دیتے تھے لیکن ساتھ ہی اس طرح طلاق دینے والے کو اس جرم پر سزا بھی دیتے تھے کہ اس نے کتاب اللہ کے مقرر کیے ہوئے قاعدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سزا کی موجودگی میں اس طریقۂ طلاق کو وہی شخص اختیار کر سکتا تھا جو اپنے ارادہ طلاق میں اتنا پختہ اور اتنا سنجیدہ ہو کہ سزا کا اندیشہ بھی اس کو اس

نہ روک سکے۔ اب غور کیجیے کہ اگر ایک شخص اپنے ارادۂ طلاق میں اتنا مضبوط ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح طلاق دینا اسلامی تعزیرات کا ایک جرم ہے اور اس کی اس کو لازماً سزا بھگتنی پڑے گی، وہ اپنی بیوی کو طلاق دے ڈالتا ہے تو آخر ایسے شخص کو اس کی بیوی کے ساتھ باندھے رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بیگم صاحبہ بجائے اس کے کہ اس طریقہ طلاق ہی کو کالعدم قرار دینے کے لیے قانون بنوائیں، اس بات کی کوشش کریں کہ حضرت عمرؓ کا طریقہ ہی صحیح طریقہ پر جاری ہو جائے۔ اس سے لوگوں کو احسن طریقہ پر طلاق دینے کی تعلیم بھی ہوگی اور وہ مشکل بھی نہ پیدا ہوگی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اور اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس ملک کی عظیم اکثریت کو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل بھی نہیں ہوگا۔

طلاق کے ہر مقدمہ میں، اس کے جائز قرار دینے سے پہلے بیگم صاحبہ نے عدالتوں کے لیے یہ تحقیق کرنا بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں یا نہیں۔ یہ شرط ہمارے نزدیک بس کی گانٹھ ہے اور اس سے ہزاروں مفاسد پیدا ہوں گے۔ میاں بیوی کے تعلق میں اصلی چیز باہمی الفت و محبت ہے۔ اگر کسی جوڑے کے اندر یہ چیز باقی نہیں رہی ہے تو یہ تو ایک معقول بات ہے کہ اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر ان کے دل پھٹ چکے ہیں تو پھر یہ بات نہایت احمقانہ ہے کہ ان کو محض اس لیے ایک ساتھ باندھے رکھا جائے کہ طلاق دینے کے لیے شوہر کے پاس کوئی معقول سبب موجود نہیں ہے۔ آخر اس سے زیادہ معقول وجہ اور کیا چاہیے کہ ایک شوہر کا دل اپنی بیوی کے اندر نہیں بس رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے بیزار ہو کر اسے طلاق دے ڈالی ہے۔ اگر یہ وجہ ایک معقول وجہ ہے تو کسی مزید سبب معقول کی تلاش فضول ہے اس لیے کہ یہ وجہ موجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے طلاق دے رکھی ہے۔ اور اگر یہ وجہ ان وجوہ میں شامل نہیں ہے جن کو ایک عدالت معقول باور کر سکے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہر اس شخص کو جو اپنی ناپسندیدہ بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے اس بات پر مجبور ہونا پڑے گا کہ وہ اپنی بیوی پر کوئی سنگین الزام اور کوئی گھنونی تہمت لگائے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے اقدام کو کسی عدالت میں مشکل ہی سے معقول ثابت کر سکے گا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے یہاں بھی انگلستان اور امریکہ کی عدالتوں کی طرح جب کوئی شخص طلاق کا مقدمہ دائر کرے گا تو ساتھ ہی اپنی بیوی کے زانیہ ہونے یا کم از کم کسی سے ناجائز راہ و رسم رکھنے کا کوئی ثبوت بھی فراہم کرے گا اگرچہ وہ کتنا ہی بعید از حقیقت ہو۔ شروع شروع میں یہ چیز ضرورت سے ایجاد ہوگی اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کو سوسائٹی کا مزاج اس طرح اپنا لیگا کہ لوگوں میں اس کا احساس ہی مردہ ہو جائے گا۔

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے بیگم صاحبہ ارشاد فرمائیں کہ وہ اس مسلمان سوسائٹی پر اور اپنی بہنوں پر کوئی احسان فرما رہی ہیں یا ان سب کے حق میں کانٹے بو رہی ہیں؟

بیگم صاحبہ نے غریب شوہروں پر ایک اور چپت یہ لگائی ہے کہ

"شوہر اپنی بیوی کو ایسے تمام اخراجات ادا کرے گا جو بیوی نے طلاق کے لیے دائر کردہ مقدمہ اور شوہر کی دوسری شادی کے مقدمہ کی مدافعت کے سلسلہ میں برداشت کیے ہوں۔ یہ رقم عدالت معین کرے گی جو بیوی کے عدالت میں حاضر ہونے کے وقت ادا کی جائے گی۔ نیز شوہر اس عرصہ کے لیے بھی نان و نفقہ ادا کرے گا جب تک کہ مقدمہ زیر سماعت رہے۔"

اس نان نفقہ سے متعلق بیگم صاحبہ کا تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو شریعت سے واضح ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو بیگم صاحبہ کے خود اپنے ہی الفاظ میں سمجھ لینا چاہیے۔ اس کی وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

"نان نفقہ کی رقم شوہر کی جملہ ذرائع آمدنی، جس میں سے شوہر پر واجب الادا محصولات وضع کر لیے گئے ہوں، کے ۱/۵ حصہ سے کم نہ ہوگی۔"

مقدمہ کے اخراجات کے معاملہ میں انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر بیوی مقدمہ دائر کرنے کے معاملہ میں حق بجانب ثابت ہو تو اس کے مصارف شوہر سے دلوائے جائیں ورنہ یہ تو شوہر پر بڑی زیادتی ہوگی کہ ایک طرف تو اس غریب کو بلا وجہ ایک مقدمہ میں پھنسایا جائے اور پھر اسی سے اس مقدمہ کے مصارف وصول کیے جائیں اور وہ بھی پیشگی! اور پھر مزید ستم یہ کیا جائے کہ نان نفقہ

کے نام سے اُس کی کل آمدنی پر بیوی صاحبہ کو خمس وصول کرنے کا بھی اور وہ بھی پیشگی حق دلا دیا جائے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر بیگم صاحبہ نے اس قسم کی قانون سازی کر کے عورت کو اتنی خطرناک چیز بنا دیا تو مرد شادی کرنے کی ہمت ہی چھوڑ بیٹھیں گے۔

چند معروضات یہاں تک ہم نے بیگم صاحبہ کے مسودہ پر ایک عام تبصرہ کیا ہے۔ اور مقصود اس سے، جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے، یہ ہے کہ اگر بیگم صاحبہ اس سلسلہ میں کسی قانون سازی کی ضرورت پر مصر ہی ہیں تو اس مسودہ کو فی الواقع اُس قرآن کے مطابق کریں جس کی روشنی میں اس کے مرتب کیے جانے کا انہوں نے دعوی کیا ہے۔ اب آخر میں ہم ان کی خدمت میں صرف دو باتیں اور عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

ایک یہ کہ مغرب کی کورانہ تقلید میں یہ سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ تعدد ازواج محض ایک جاہلیت کی یادگار ہے۔ یا شوہر کو طلاق کی آزادی دینا ایک بالکل خلافِ عقل و تہذیب قانون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ہمارے اخلاقی، عائلی، اور اجتماعی نظام کے تحفظ میں بڑا دخل ہے اور ہماری انتہائی نادانی ہوگی اگر ہم ان کے سوء استعمال کی کچھ مثالوں سے متاثر ہو کر سرے سے ان کے ختم کر دینے ہی کی تدبیریں سوچنے لگ جائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اسلام نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت اسی صورت میں دی ہے جب کوئی واقعی اخلاقی، تمدنی، اور اجتماعی ضرورت اس کے لیے داعی ہو۔ مرد کو عورتوں کا باڑہ بنانے کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔ اور یہ اجازت بھی نہایت کڑی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے جن کا توڑنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کسی نئی شادی کی کوئی واقعی ضرورت موجود ہے یا نہیں، اسلام نے خود مرد کی صوابدید پر چھوڑا ہے اس امر کو کسی عدالت کے فیصلہ پر منحصر نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ضرورت کے اتنے پہلو ہو سکتے ہیں کہ کسی متعین ضابطہ کے تحت ان کو منضبط کرنا سہل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اسلامی قانون اس صورت میں تو مداخلت کرتا ہے جب ایک مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر کے کوئی ناانصافی یا حق تلفی کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ اس معاملہ میں کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا

یہی ہے کہ یہ چیز ضابطہ بندی کی ہے ہی نہیں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے خاندان کے نظم کو سنبھالے رکھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ مثلاً ایسے بچوں کا باپ مر جاتا ہے جن کی ولایت کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مرد بچوں کی ماں کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لے۔ کیونکہ بیوہ کے نکاح نہ کرنے میں بھی اندیشہ ہے۔ اور کسی غیر جگہ نکاح کرنے میں بھی بچوں کے حقوق تلف ہونے اور ماں کی محبت سے محروم ہو جانے کا ڈر ہے۔

اسی طرح بے شمار صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص کا مقصد ازدواج ایک عورت سے پورا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن نہ تو وہ خود اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کی بیوی ہی طلاق لینے کے لیے تیار ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص ایک عورت سے پوری جنسی تسکین نہ حاصل کر پاتا ہو اور وہ کسی مزید نکاح کی ضرورت محسوس کرے۔

اجتماعی اور معاشرتی ضرورت کی مثالیں ہم اوپر انگلستان اور یورپ کے حالات سے پیش کر چکے ہیں۔ ان کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

الغرض اس کی اتنی شکلیں ممکن ہیں اور اس کے اتنے واضح اور غیر واضح اسباب ہو سکتے ہیں کہ قانون کے لیے ان سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ قانون اس معاملہ میں اگر کوئی مؤثر مداخلت کر سکتا ہے تو صرف اس شکل میں کر سکتا ہے جبکہ نکاح کرنے والے شخص کی طرف سے کوئی تعدی صدور میں آئے۔

اسی طرح طلاق کے معاملہ میں یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ایک ابغض المباحات ہے اور اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے لیکن اسلام اس پر ہرگز ایسی پابندیاں عائد نہیں کرنا چاہتا جن کے سبب سے اس شخص کے لیے بھی طلاق دینا ناممکن ہو جائے جو کسی وجہ سے اپنی بیوی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی راحت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اس کی بنیاد الفت و محبت پر قائم ہو۔ اگر یہ بنیاد اکھڑ چکی ہو تو مصنوعی طریقوں سے اس کو جمائے رکھنے کی کوشش بسا اوقات مزید خرابیوں کا سبب بنتی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ایسے حالات میں میاں اور بیوی دونوں کو الگ

الگ شرائط کے تحت یہ حق دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں ۔

بیگم صاحبہ سے دوسری گذارش یہ ہے کہ اس ملک میں معاشرتی خرابیوں کی اصلاح اگر پیش نظر ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے اندر مذہب کے تحت اپنے حدود اور اپنے حقوق کی نگہداشت کے لیے بیداری پیدا کی جائے ۔ اور اس سلسلہ میں اگر قانون سازی کی ضرورت پیش آئے تو یہ کام سو فیصدی اسلام کے مطابق ہونا چاہیے ۔ اسی طرح ہماری قوم اپنے فطری داعیات اور اپنی ملی روایات کے مطابق ترقی کر سکتی ہے ۔ اگر یہ راستہ چھوڑ کر یہاں مغرب کی کورانہ تقلید کی تلقین کی گئی اور آدھی تیتر آدھی بٹیر قسم کی قانون سازی کی گئی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری قوم بالکل شتر مرغ بن کر رہ جائے گی ۔